بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

توہینِ رسالت اور ہمارا پیرایۂ احتجاج

ڈنمارک کے ایک اخبار نے ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء میں ۱۲ خاکے شائع کئے۔ چند ماہ بعد یہی توہین آمیز خاکے چند دیگر یورپی ممالک کے رسائل واخبارات نے ری پرنٹ کر دیے جس کے باعث نہ صرف ڈنمارک کے ۲ لاکھ سے زائد بلکہ پوری دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے قلوب وقفِ پیچ وتاب ہو گئے۔ غیر مسلم بالعموم اور اہل یورپ بالخصوص اس بات کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ مسلمانوں کے نزدیک حضور ختمی مرتبت (فداہ ابی وامی) ﷺ کا مقام بلند وبالا کیا ہے۔ ہمارے دلوں میں اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کی عظمت ورفعت اور احترام وعزت کس شدت کی ہے۔ بلاشبہ دنیا کی دیگر قومیں بھی اپنے اپنے بانیانِ مذاہب کی عزت کرتی ہیں حتیٰ کہ ان میں سے اکثر کی پرستش تک بھی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہ نہیں جانتے کہ ایک نبی کا صحیح مقام کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح اپنے متبعین کی زندگی کا جزو بن چکا ہوتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی۔ مال ودولت دنیا کی عزیز سے عزیز شے، پیاری سے پیاری متاع سے بھی زیادہ عزیز! اور یہ بات کسی کے ذاتی جذبات کی نہیں بلکہ قرآن کریم کی رو سے مومن ہونے کی شرط ہے' النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم و ازواجہ' امھٰتھم (۶/۳۳) دنیا کی تقریباً ہر قوم نے اپنے بانی مذہب کو تصویر یا مجسموں کی صورت میں اپنے سامنے رکھا ہے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب بھی کسی عظیم شخصیت کو تصویر یا مجسمہ کی شکل میں سامنے رکھ لیا جائے تو اس کے مقام کا وہ مرتبہ اور بلندی نہیں رہتی۔ اس کے متعلق وہ احترام نہیں رہتا جو اس کے حسنِ کردار کی بدولت قلب ونگاہ کی روشنی کا باعث ہوتا ہے۔ یہ لامحدود احترام محسوس پیکروں میں آ کر محدود ہو جاتا ہے۔ اس باب میں حضورِ نبیٔ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی انفرادی حیثیت کی مالک ہے کہ آپ کی عظمت تصویروں اور مجسموں میں محبوس ہو کر محدود نہیں ہوئی۔ وہ ہر قلبِ مومن میں، ناپیدا کنار بحرِ ذخار کی مثل موجزن ہے۔ مذکورہ بالا یورپی اخبارات ورسائل نے حضور ﷺ کی اس منفرد حیثیت کو (معاذ اللہ) ختم کر کے اسی مقام پر لے آنے کی کوشش کی ہے جس مقام پر وہ اپنے بانیانِ مذاہب یا دیگر بزرگ شخصیتوں کو لا چکے ہیں۔.....اور مسلمان اسے ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

وہ ذاتِ گرامی ﷺ جن پر ایمان ہمارے لئے باعثِ نجات وسعادت اور جن کی محبت سرمایۂ حیات ہے ہمارے نزدیک معراجِ انسانیت کا مظہرِ کامل اور دنیا وآخرت کی سرفرازیوں کا مقدس پیکر ہے۔ اس ذاتِ فخرِ موجودات کی توہین تو کجا ہم تو ان کوچوں اور رگلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے جن کے ذرات کو ان کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہوگئی۔ یہ معاملہ کسی ایک فرد سے متعلق

ہے اور نہ ہی کسی ایک ملک کے مسلمانوں سے۔ یہ پوری ملت اسلامیہ کے جذبات کا مشترکہ مسئلہ ہے اس لئے اس کے متعلق اسی انداز سے سوچنا اور عمل کرنا چاہئے۔ لیکن یہ کام حکومتوں کی سطح پر کرنے کا ہے۔ تنظیم ممالکِ اسلامیہ (OIC) کے فعال ہونے کے لئے یہ نادر موقعہ ہے۔ یو۔این۔او اور یورپی یونین میں اس مسئلہ کو موثر طور پر اٹھایا جانا چاہئے اور ناموسِ رسالت کے تحفظ کے لئے کوئی موثر قانون پاس کرایا جانا چاہئے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر مسلم ملکوں کی طرف سے متفقہ طور پر یہ مطالبہ پیش کیا جائے تو وہ ضرور تسلیم کر لیا جائے گا۔

گذشتہ دنوں سے ہمارے ہاں احتجاجی مظاہروں میں جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ کسی طرح بھی قابلِ تحسین نہیں ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بعض شر پسند اور اقتدار پرست عناصر اس مقدس اور پاکیزہ تحریک کو اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا محبتِ رسول ختمی مرتبت ﷺ کے اظہار کا یہی قرینہ ہے اور کیا ہمارا پیرایۂ احتجاج یہی ہونا چاہئے جو ہم نے گذشتہ دنوں اختیار کیا۔ یقیناً نہیں! ہمارے خیال میں ہمارا احتجاج اتنا مہذب' اتنا باعظمت و باوقار ہونا چاہئے کہ مغرب کے در و دیوار لرز جائیں لیکن کسی کو ہمارے اوپر اعتراض کرنے کی جرأت نہ ہو۔ اگر پاکستان کے کروڑوں عوام پرامن انداز سے ایک ترتیب اور نظم کے ساتھ' درود و سلام کے زمزمے بلند کرتے ہوئے بغیر کسی نعرہ بازی اور غوغا آرائی کے' سڑکوں پر آتے تو کیا اس نظارہ سے دنیا متاثر نہ ہوتی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا ہمارا یہ انداز بارگاہِ رسالت ﷺ میں مقبول و پسندیدہ نہ قرار پاتا؟؟؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یادِ رفتگان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور سرمدی

رفتید' ولے نہ از دلِ ما

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ)

ہر انسان اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی میلانات و عواطف' فکری رجحانات اور علمی و ادبی تحریکات سے کسی نہ کسی درجہ میں متاثر ہوتا ہے۔ اس میں کسی کا استثناء نہیں ہے خواہ وہ کوئی عامی ہو یا خاص۔ مگر اس کے باوجود بعض شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی فکر' اپنے فلسفہ' اپنے انداز' اپنے تخلیقی شاہکاروں اور اپنی سیرت و کردار سے نہ صرف اپنے ماحول کو متاثر کر دیتے ہیں بلکہ آنے والے زمانے پر بھی گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ اسلم جیراجپوری کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت اگرچہ روایتی انداز میں ہوئی تھی مگر فکر و نظر کی پختگی آتے ہی انہوں نے تقلید کی اندھی پٹی کو اپنی آنکھوں سے اتار پھینکا۔ کتاب اللہ کی جامعیت و اکملیت کا احساس ہوتے ہی انہوں نے خارجی تنکوں کا آسرا لینا ترک کر دیا تھا۔ یہ ان کی شخصیت کا اعزاز ہے کہ انہیں سر سید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ جیسے مصلح قوم کے افکار سے خوشہ چینی کا موقع ملا' اقبال علیہ الرحمۃ جیسے مفکر قرآن سے برسوں گفت و شنید اور خط و کتابت کا اعزاز حاصل رہا' جناب پرویز جیسی عبقری (Genius) شخصیت نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور صاحبِ ''فقہ القرآن''۔ عمر احمد عثمانی کو ان سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا۔

آپ نے ایک اہل حدیث گھرانے میں آنکھ کھولی۔ تمام متداول روایتی علوم' حدیث' فقہ و اصول' منطق و فلسفہ' عربی ادب' ریاضی' فارسی اور معقولات کی منازل نہایت خوش اسلوبی سے طے کیں۔ قرآن کریم حفظ کیا۔ یوں تحصیل علم کے بعد جب فارغ ہوئے تو مسلکی قدر دانوں اور عقیدت مندوں کا ایک ہجوم آپ کے پیچھے تھا۔ ہاتھ چومنے اور پاؤں چھونے والوں کی ایک دنیا آپ کی منتظر تھی۔ پندار نفس کے لئے پرستاروں کی فوج ظفر موج میں بڑی جاذبیت ہوا کرتی ہے۔ مگر جب قرآنی تعلیم آپ کے سامنے بے نقاب ہوئی تو آپ نے ایسی تمام جاذبیتوں کو درویشانہ استغناء کے ساتھ جھٹک دیا۔ علامہ اقبال نے مرد بزرگ کے عنوان سے چند اشعار کہے ہیں درج ذیل اشعار حافظ جیراجپوریؒ پر صادق آتے ہیں:

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
مثل خورشیدِ سحر' فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ' معانی میں دقیق

جن احباب کی نظروں سے حافظ اسلم جیراجپوری کی تصانیف بالخصوص تعلیمات قرآن' عقائد اسلام' الوارثتہ فی الاسلام اور نکات قرآن گذری ہیں وہ اس مصرعہ

بات میں سادہ وآزادہ' معانی میں دقیق

کا مطلب بخوبی جانتے ہیں۔ روایات کی خاردار جھاڑیوں سے دامن چھڑا کر اور تقلید کے اندھیروں سے نکل کر جب وہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں آئے تو انہیں احساس ہوا کہ دین اصل میں کیا تھا اور اسے کیسے تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

''چونکہ مختلف استبدادی سلطنتوں نے مختلف علماء کی فقہیں اختیار کیں۔ اس لئے امت متعدد فرقوں میں بٹ گئی۔ ان متقدمین کا اختلاف بظاہر فروعی کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اصولی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص امام کی تقلید کا بھی عقیدہ رکھتا ہے۔ لہٰذا جس طرح سنی اور شیعہ میں اصولی اختلاف ہے اسی طرح اہل سنت کے مذاہب اربعہ بھی جدا جدا فرقے ہیں۔ ہر ایک کے امام الگ الگ ہیں' کتابیں الگ ہیں اور علماء الگ الگ ہیں۔

اس نتیجہ پر پہنچتے ہی دفعتاً حدیث کی حالت بھی سامنے آ گئی کہ وہ بھی مرکز سے نہیں ملی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ یا آپ کے صحیح جانشینوں نے اس کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کے حوالہ نہیں کیا۔ بلکہ تمام تر رواۃ سے ملی ہے جنہوں نے رضا کارانہ اس کو روایت کیا ہے اور جن کی کوئی مرکزی حیثیت نہیں تھی۔ اس حقیقت پر نگاہ پڑتے ہی میری روح لرز اٹھی اور میں نے کہا' یا اللہ! سوائے تیری کتاب کے کہیں پناہ نہیں ہے۔ جیسا کہ تو نے خود فرمایا ہے۔

ولن تجد من دونه ملتحدا (۱۸/۲۷)۔

یہ خیال اس وقت دل میں بمنزلہ تخم کے پڑ گیا جو برابر پرورش پاتا رہا..... جب قرآنی حقائق اللہ نے میرے دل پر کھولے اس وقت حدیث کی اصلی حیثیت واضح ہو گئی کہ وہ دینی تاریخ ہے۔ خود اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں۔ اگر دین ہوتی تو رسول اللہ ﷺ قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر امت کو دے جاتے۔ دین کے لئے قرآن کافی ہے جو کامل کتاب ہے اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے''۔

(ماخوذ از مضمون بعنوان ''میری طالب العلمی''۔۔۔ بحوالہ ''نوادرات'' از اسلم جیراجپوری۔ صفحہ ۳۲۶' ۳۲۵)۔

شاعر مشرق علامہ اقبال نے ۱۹۱۵ء میں اپنی کتاب مثنوی اسرار خودی شائع کی تو اس میں ایک باب حافظ شیرازی پر بالخصوص اور تصوف پر بالعموم تنقید سے متعلق تھا۔ حافظ شیرازی کو مسلمانوں کے ہاں محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ولی اللہ اور بہت بڑا صوفی خیال کیا جاتا تھا (اور آج بھی کیا جاتا ہے)۔ مثنوی کے چھپتے ہی حافظ شیرازی صاحب کے عقیدت کیشوں کے حلقہ میں ایک کھلبلی مچ گئی' ایک کہرام برپا ہو گیا۔۔ نتیجتاً اخبارات' مجلّہ جات اور پریس میں اقبال کی مثنوی کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار ہونے لگا۔ بعض لوگوں نے تو اس کے جواب میں ایک مثنوی بھی لکھ ڈالی۔ یہ مخالفت علمی سطح سے گزر کر بازاری سطح پر اتر آئی۔ کتاب کی بجائے مصنف (علامہ اقبال) کی ذات ہدف ملامت بننا شروع ہو گئی..... ایسے میں حافظ اسلم جیراجپوری

نے اقبال کی مثنوی پر ایک متوازن اور مبسوط مقالہ ''الناظر'' میں تحریر کیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء میں جیراجپوری صاحب کو لکھا:

''آپ کا تبصرہ اسرار خودی پر ''الناظر'' میں دیکھا ہے جس کے لئے میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں

؎ دیدمت مردے دریں قحط الرجال

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا۔ خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی''۔

(بحوالہ تصوف کی حقیقت از پرویز؛ صفحہ ۳۰۶)۔

اقبالؒ سے آپ کو کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انٹرکالجیٹ مسلم برادر ہڈ کی طرف سے اقبال کی زندگی میں پہلا یوم اقبال جنوری ۱۹۳۸ء میں منایا گیا تھا۔ اس میں شرکت کے لئے دہلی سے جو قافلہ حاضر ہوا تھا' اس کی قیادت حافظ اسلم جیراجپوری کے حصے میں آئی تھی۔

اب ہم حافظ صاحب کے ایک ایسے شاگرد کا اقتباس درج کرتے ہیں جنہوں نے رجعت الی القرآن (back to Quran) کی اس تحریک کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ دیکھئے ایک شاگرد اپنے استاد کے بارے میں کیا لکھتے ہیں:

''میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں ناپختگی محسوس کرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور عندالفرصت مولانا سے یہ کتابیں ازسرنو پڑھ لوں۔ چنانچہ (غالباً) ۱۹۳۵ء میں میں نے اس کے متعلق مولانا سے ذکر کیا اور وہ اس کے لئے بخوشی رضامند ہو گئے۔ چنانچہ میں شملہ سے تنہا دہلی آ گیا اور چونکہ مولانا بھی اس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے اس لئے فیصلہ یہی ہوا کہ میں انہی کے ساتھ رہوں۔ یہ چھ مہینے کا عرصہ میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے ہے۔ میں آیا تو تھا عربی ادب کی ناپختگی دور کرنے کے لئے لیکن (وہ جو کہتے ہیں کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے) ہمارا بیشتر حصہ قرآن کے رموز و غوامض پر بحث و تحقیق میں گزرتا..... میں اس زمانہ میں (اپنی تصنیف) معارف القرآن کے ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا تھا اس لئے میرے پیش نظر بھی ہر وقت قرآن رہتا تھا اور مولانا کے تو سینہ ہی میں قرآن تھا۔ نہ معلوم اس چھ ماہ کے عرصہ میں ہم نے قرآنی تحقیق کے ضمن میں کتنا کچھ کھنگال ڈالا۔ میں نے اپنی حیثیت ہمیشہ ایک شاگرد کی سی سمجھی لیکن مولانا کی کشادہ نگہی کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے مسئلہ پر بھی انہوں نے اگر دیکھا کہ میری رائے صحیح ہے تو وہ اسے ایسی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے کہ بعض اوقات مجھے شبہ گزرنے لگتا کہ وہ کہیں میرے پاس خاطر سے ایسا تو نہیں کرتے۔ (لیکن بعد کے تجربے نے بتایا کہ دین کے معاملہ میں مولانا کسی کے پاس خاطر نہ کوئی بات قبول کرتے ہیں نہ کوئی خیال چھوڑتے ہیں۔ وہ اختیار صرف اسے کرتے ہیں جسے حق سمجھتے ہیں اور اگر کسی بات کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ قرآن کے مطابق

نہیں تو اسے نہایت جرأت اور آسانی سے جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں)''۔

(ماخوذ از مضمون بعنوان ''وہ مرد درویش''.....

''سلسبیل'' از پرویز' صفحہ ۱۲۳)۔

علامہ اسلم موضع جیراجپور ضلع اعظم گڑھ' بھارت میں ۱۸۷۹ء کے لگ بھگ بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ حفظ قرآن سید مظہر حسین مرحوم کے مدرسے میں انجام دیا جہاں پر حافظ عبدالکریم کی زیر تربیت آپ نے تقریباً دو سال میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اپنے زمانے کے نامور اساتذہ سے کسب علم کیا۔ بنیادی طور پر آپ کے دو ہی اساتذہ تھے' مولوی فتح اللہ اور مولوی سلامت اللہ صاحب جو آپ کے والد بھی تھے۔ ان کے علاوہ نواب صدیق حسن خان' مولوی ذوالفقار احمد' شیخ حسین عرب' مولوی محمد حسین بٹالوی' مولوی عبدالحق اور مولوی برکات احمد صاحب وغیرہ کا نام آپ کے اساتذہ میں آتا ہے۔ آپ نے بچپن ہی سے کتابیں لکھنے کی طرح ڈالی۔ اعلیٰ ذوق کے شاعر بھی تھے جن کی شاعری قومی اور ملی مسائل اور ان کے حل کے گرد گھومتی ہے۔ وراثت سے متعلق فقہاء کی بعض تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیا' خاص طور پر کلالہ' عول اور یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق۔ ان کی مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں..... افادات اسلم' قواعد اسلمیہ (فارسی قواعد' یہ کتاب آپ نے طالب علمی کے دوران لکھی تھی)' نکات القرآن' تاریخ القرآن' تعلیمات قرآن' نامور مسلمان خواتین' ہمارے دینی علوم' نوادرات' حیات حافظ (شیرازی)' حیات جامی' الوراثۃ فی الاسلام' عقائد اسلام' ارکان اسلام' جواہر ملیہ (شاعری)' تاریخ نجد اور تاریخ الامت۔

تحریک پاکستان کے نامور رہنما علامہ شبیر احمد عثمانی کے بھتیجے اور علامہ ظفر احمد عثمانی کے بیٹے عمر احمد عثمانی کے نام سے دینی اور علمی حلقوں میں کون واقف نہیں؟ ان کی کتاب فقہ القرآن گویا قرآنی احکام کا دائرۃ المعارف (Encyclopaedia) ہے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے' عمر احمد عثمانی کو بھی حافظ اسلم صاحب سے شرف نیازمندی حاصل تھا۔ حافظ صاحب کی وفات پر اپنی یادداشتوں کو تازہ کرتے ہوئے عمر احمد عثمانی رقم طراز ہیں:

''مولانا جامع نگر (اوکھلا) دہلی میں رہتے تھے اور ہر جمعہ کو شام کے وقت محترم پرویز صاحب کے مکان واقع ترکمان روڈ نئی دہلی میں تشریف لے آیا کرتے تھے' جمعہ کو وہیں فروکش رہتے.....اور سنیچر کی صبح کو واپس اوکھلے تشریف لے جاتے تھے۔ جمعرات اور جمعہ کی شام کو میں بھی اکثر ترکمان روڈ چلا جاتا تھا۔

میں نیا نیا مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا تھا۔ طبیعت میں ذرا جوش اور ولولہ تھا۔ اپنے ماحول سے مطمئن نہیں تھا۔ مگر قرآن تک پہنچنے میں کتنی خاردار جھاڑیاں تھیں جو دامن کش تھیں۔ میں ابھی نوگرفتار تھا۔ بہت سی باتیں دل کو اپیل کرتی تھیں تو کتنی ہی باتیں ایسی بھی تھیں جن سے طبیعت کو وحشت ہوتی تھی۔ میں طالب علمانہ انداز میں پرویز صاحب سے ان باتوں پر جھگڑتا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور پرویز

صاحب نہایت شفقت سے مجھے سمجھاتے رہتے تھے کیونکہ انہیں بھی یہ اطمینان حاصل تھا میں سمجھنے کے لئے جھگڑتا ہوں نہ کہ اعتراض کے لئے۔ میں کسی بات کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا تھا جب تک میرا دل اس پر مطمئن نہ ہو جائے۔ پھر بھی بہت سی باتیں ایسی رہ جاتی تھیں جن پر میں مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ ایسی تمام باتوں کو میں جمعرات کے انتظار میں رکھ چھوڑتا تھا کہ مولانا تشریف لائیں گے تو ان سے حل کرلوں گا۔ مولانا تشریف لاتے۔ میں اپنی الجھن ان کے سامنے رکھتا۔ بہت شفقت اور توجہ سے بات سنتے اور چند لمحوں میں گتھی سلجھا دیتے اور مطمئن کر دیتے۔ نہ لمبی چوڑی تقریریں فرماتے نہ منطقیانہ دلائل و براہین کے انبار لگاتے۔ وہ مری باتوں سے بڑی آسانی سے یہ اندازہ لگا لیتے کہ میرے دل میں کہاں پھانس چبھی ہوئی ہے اور بس وہ اس پھانس کو نکال دیتے اور اس کے بعد وہ سکون قلب میسر آجاتا جس کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ مولانا کے الفاظ نہایت جچے تلے' مالہٗ وما علیہ پر حاوی اور (To the point) ہوتے تھے۔ لمبی چوڑی باتوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔''

(ماخوذ از مضمون بعنوان ''اپنے وقت کا ایک امام'' از عمر احمد عثمانی..... ہفت روزہ طلوع اسلام ۷ جنوری ۱۹۵۶ء)۔

علم کا یہ بحر ذخار' تعلیمات قرآنی کا مینارۂ نور اور بیسویں صدی کا یہ روایت شکن مجاہد (Incoclast) ' سرسید کی چلائی ہوئی تحریکِ رجعت الی القرآن کو اپنے علم و عمل اور سیرت و کردار سے مہمیز کرتا ہوا ۲۸ دسمبر ۱۹۵۵ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر کے ارتقاء کی اگلی منازل کی طرف بڑھ گیا۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویزؒ

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

اسلام ایک زندہ نظام حیات بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے دین یعنی نظام حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں اور اس کا اصل الاصول امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصور اسلام کی رو سے اقامت صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطور خیرات دے دینا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج بھارت کا مسلمان بایں ہمہ بے بسی و بے کسی انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے اپنی حکومت کا قیام لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ۔۔ (مفہوم) یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ (۲۲/۴۱)۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کیلئے استخلاف فی الارض ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورہ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تا کہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو۔۔۔ یعبدوننی۔ لا یشرکون بی شیأ (۲۴/۵۵)۔۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپؐ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپؐ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنت یعنی باغ و بہار آخرت۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی۔۔ اس

نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔اس پر آپؐ نے فرمایا کہ۔۔نعم النصر و التمکین فی البلاد ۔۔اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔(الکامل)۔

اسلام کا تقاضا: یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظام حیات) بننے کا تقاضا' جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اس سے اسلام' اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا'' (خطبہ الٰہ آباد۔۱۹۳۰ء)۔

اس سے بھی پہلے' انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر رکھی تھی کہ:

''اسلامی نقطۂ نگاہ سے' مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئت اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔''

اس مملکت میں' عبادت نام ہوتا ہے قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامت صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد معاشرہ' ان قوانین کا از خود' بہ طیب خاطر' اتباع کرتے جائیں اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افراد معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامان نشوونما مہیا کرنا۔اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

''اسلام' تخت و تاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہد وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔'' (خطبات)۔

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ:

''اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (حیدرآباد دکن' ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق و تشکیل کی وجۂ جواز اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس

کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ: آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجۂ نزاع اور سب سے شدید سبب تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے۔ کہ۔۔ انا وجدنا اباء نا علیٰ امة و انا علی اثارھم مھتدون ۔ (۴۳/۲۲)۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ ہم انہی کے نقوش قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایات کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے'۔ ان سے' اس کے جواب میں کہا جاتا کہ۔۔۔ اولو جئتکم باھدیٰ مما وجدتم علیه اباء کم ۔۔ (۴۳/۲۴)۔ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ و اجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو' تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظام نو کی ضرورت نہیں۔۔ حسبنا ما وجدنا علیه اباء نا ۔ (۵/۱۰۴)۔۔ وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے'۔۔ یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظام جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلک آباء کی' اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسولؐ اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ۔۔ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا۔۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا' تو فتمسکم النار۔۔ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا' ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریات حیات و تصورات زندگی' ان تمام روایات کہنہ اور مسالک قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر۔۔ لا الٰہ الا اللہ۔۔ ہے۔ اس میں لا الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے' ہر شے کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر' اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الا اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں ''بت پرستی'' کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے

اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدم حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا۔۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکت پیہم اور سعی مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ''حرکت پیہم'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ، قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نقطہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ ''وہائیٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ:

''بت پرستی کی کنہ و حقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز، ص ۱۲)۔

اس قسم کی بت پرستی میں، ایک زندہ اور متحرک نظام حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں، ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب، دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم، اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

''زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے..... اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز، ص ۳۵۸)۔

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ، اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے، اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروان انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھئے۔ جوہر زندگی کی نمود، اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں، تو یہ انسانی زندگی میں نشو و ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (Moral) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (Immoral) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (Amoral) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (Amoral) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبال کہتا ہے کہ: ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید!
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآن کریم نے' اپنا تعارف کراتے' یا یوں کہئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ۔۔انا انزلنہ فی لیلۃ القدر ۔(۱/۹۷)۔یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے اس کی آمد سے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو' جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آ رہے تھے' ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔اقبالؔ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ:

''اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔'' (خطبہ الٰہ آباد)۔

روشِ کہن: ہمارا مروجہ مذہب' ہماری شریعت' ہمارا کلچر' ہماری روایات' ہمارا فلسفۂ حیات' ہمارے رسوم و مناسک' غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں' عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔اقبال نے اس کے لئے ''عجمی اسلام'' کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دور عباسیہ) میں ہوا تھا' لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔۔اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت' طریقت' تصوف' کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد' ان ''بتان عجم'' کو حریم کعبہ سے نکال کر' اسے خالصتہً ''خدا کے گھر'' میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں ''جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے'' اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سرِ نو مستقل اقدار خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت: ''بتان عجم'' کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت' اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت' ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ: ؎

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اس نظام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی' اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

قرآنی پاکستان میں زندگی کو ایک لوح سادہ (Clean Slate) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملت پاکستانیہ' حضور نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظ گرامی کو پورے حزم و یقین اور کامل وثوق و اعتماد کے ساتھ' ببانگ دہل دنیا کے سامنے دہرا سکتی جنہیں آپ نے اپنے حجتہ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

الا ۔کل شئی من امرجاھلیت تحت قدمی موضوع۔

ہاں! زمانۂ جاہلیت کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

قرآنی پاکستان' اس عظیم انقلابی اعلان کی نشرگاہ ہوتا۔ اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا۔ کہ ؎

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

حاکم و محکوم کا امتیاز: قرآنی مملکت میں' حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا' بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ۔۔ کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر ۔(۳/۱۰۹)۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوع انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے' تقسیم عمل کے اصول کے مطابق' مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں' افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدین' یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں ۔۔ لا تملک نفس لنفس شیئا۔ و الامر یومئذ للہ (۸۲/۱۹)۔۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے' نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانین خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ کونوا عبادا لی۔۔(۳/۸۷)۔۔ تم میرے محکوم ہو جاؤ۔۔ نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔ اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں' این است و بس

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے' تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ۔۔مالنا ملک۔ بل لنا امیر ۔۔ہمارا بادشاہ کوئی نہیں' ہمارا صرف امیر ہے۔واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہنمائی کرنے والے کے ہیں۔امت' جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے' اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر' صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں' ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:

''یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور' طاقت ور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔''

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا۔کہ:

''یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں۔ تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔''

خلافت اور ملوکیت میں فرق: وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے' بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔خلیفہ تمام افراد معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں' بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:

''لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں' میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانون خداوندی کے مطابق اور جو کچھ لوں' اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔''

اور یہ بھی کہا تھا کہ:

''تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔''

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افراد معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات

کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔۔۔لہٰذا' مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں: اہل وعیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زینۃ الحیوٰۃ الدنیا (۱۸/۴۶)۔۔کہا ہے۔انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قرۃ اعین۔(۲۵/۷۴)۔۔ کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔۔انما اموالکم و اولادکم فتنۃ۔(۸/۲۸)۔یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصد حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن۔۔ان من ازواجکم و اولادکم عدوالکم۔ فاحذروھم (۶۴/۱۴) ''یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔'' تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقام بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے۔۔ فاحذروھم ۔۔ان سے بہت محتاط رہنا۔۔قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھائی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امور خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امور مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اسے طلاق دے دی۔اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کر لیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہو گا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی؟ یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتدا ہوا کرتی ہے۔قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔۔اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔۔قحط کے زمانے میں آپ نے گلی

میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہو گا۔۔؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمر کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔۔ انکا دستور تھا کہ

> ''جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔۔ اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس کی وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں ان سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے۔ چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔'' (تاریخ عمرؓ۔ ابن جوزی)

عدل: قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے۔ اور اس میں کسی کی رورعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ۔۔ انا جعلنٰک خلیفة فی الارض۔ فاحکم بین الناس بالحق۔ و لا تتبع الھویٰ (۲۶/۳۸)۔ تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون، جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہوگا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف، سب سے پہلی آیت میں، الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات (یا

بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر وتبدل ہوتا رہے گا۔لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد' یا پارلیمان تو ایک طرف' ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ جو مملکت' قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵/۴۴)۔

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا' قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اوران قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں' نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات ومیلانات اثرانداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی موثرات دخیلِ کار:

اس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی' نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔(۲/۴۸)۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا' دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔''اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔''(۴۱/۵۵)۔ اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم' شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں۔۔وامتازو الیوم ایھا المجرمون (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم' مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔۔لا تکسب کل نفس الا علیھا (۶/۱۶۵)۔اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔۔ولا تزر وازرۃ و وزر اخریٰ (۶/۱۶۵) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں' بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔اس باب میں' اورتو اور' خود حضور رسالتمآب ﷺ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ:

اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔(۶/۱۵)۔

اور اس کے بعد فرما دیا کہ اگر میری چہیتی بیٹی۔۔ فاطمہؓ۔بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے' ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہئے تھی' پرائیویٹ مکان میں دی ہے' تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر' اسے ازسرِنو پبلک میں سزا دی۔۔جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو' تو آپ نے' گورنر' اس کے بیٹے' اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس

کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا' کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی' آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے مقدمہ ختم ہونے کے بعد' آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو' خود خدا کا قانون مکافات عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔ (۴۰/۱۹)۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ 'حسبِ دستور' افراد معاشرہ کے حالات کا براہ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک خیمہ کے اندر' ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولہے پر چڑھا دو۔۔ بیٹی نے کہا کہ امی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی' کیوں کہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو' خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آ کر بیوی سے کہا کہ صبح اس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آ جائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟: لیکن افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسر اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے ارباب حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے' اس کی اصلاح کی صورت کیا ہو گی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں۔۔ کان فی المدینۃ تسعۃ رھط یفسدون فی الارض ولا یصلحون (۴۸/۲۷)۔ مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہ راست پر آ جائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے' رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے' رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں' امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ۔۔ ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا ۔۔جو ہمارے قوانین کو فراموش کردے۔۔۔واتبع هوٰه ۔۔اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔وكان امره فرطا (۱۸/۲۸) ۔اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں' تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

اگر ایک ناک کٹا' سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو' تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے' تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں' ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہوتی ہے' کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے' تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعی اول۔۔حضورؐ نبی اکرم نے خود فرمادیا کہ انا اول المسلمین ۔سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِتسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی' وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا جس کی رو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے' آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس: یہ تھا عدل۔۔یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔۔اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدل عمرانی (Social Justice) کہا جاتا ہے۔سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہورہی ہے اوراس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (Just) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے۔مختلف افراد کے حق (یا واجب۔۔Due) کا تعین، پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اوراسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (Valid Moral Principales) کے مطابق ملے۔لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں، یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گذرا ہے، اس میں (Emil Brunner) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔وہ کہتا ہے کہ:

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (Just) اور فلاں ظلم پر مبنی (Unjust) ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔
>
> (Justice and The Social Order)

رزق کا حق: قرآن کی رو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ، ازروئے قوانین خداوندی حقدار ہے، عدل کہلائے گا اور یہ قوانین، قرآن کے اندر موجود ہیں۔لہٰذا، قرآن کی رو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے، ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے، ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:

(مفہوم) سطح ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔(۱۱/٦)۔

قرآنی مملکت' جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے' خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔اس لئے تمام افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ:

(مفہوم) (تم مطمئن ہو کر بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ (٦/۱۵۲)۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجۂ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے' رفاہی ہے یا اشتراکی۔۔لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہوسکتی ہے۔۔یعنی تمام افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامان زیست کی ذمہ داری۔۔اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا' اور' جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے' یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعۂ زمین ہے اور قرآن کی رو سے' زمین پر۔۔جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ' انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے۔۔انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔اسے قرآن نے سواء للسائلین۔(۴۱/۱۰) قرار دیا ہے۔یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔کسی کی ملکیت میں نہیں چلے جانا چاہئے۔اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کردیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔اس کے بعد' جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع وعریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کردیا گیا کہ۔۔لنا رقاب الارض۔۔زمین مملکت کی رہے گی۔

ربوٰا کا مفہوم: زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد' سب سے اہم سوال' حصول دولت کا ہے۔عصر حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (Labour) کا ہونا چاہئے یا

سرمایہ (Capital) کا اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے اس سے ایسا نظر آتا ہے۔ گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ ارباب فکر ونظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربٰو کو حرام قرار دیا ہے اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ربٰو کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر ہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (Commercial Interest) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے' ربٰو کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس' ربٰو کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ۔۔ وذروا ما بقی من الربوٰ۔۔ ربٰو میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ۔۔ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا اور رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربٰو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظام مملکت کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربٰو کے معنی ہیں ''سرمایہ پر بڑھوتی''۔۔ (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا' ربٰو کا مرتکب' اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے ''خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا' قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے' حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا' سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ (۵۳/۳۹)۔۔ یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (Surplus Money) کی' جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے' کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (۲/۲۱۹)۔۔ ''تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے' سب کا سب۔'' اسی کی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ:

> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔ اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے

مانگا جائے اسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یارسولؐ اللہ! یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم: کمیونزم کا سنگ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے:

From each according to his capacity's to each according to his needs.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں' سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مال غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسولؐ اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادہ شدہ کو دگنا حصہ' کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افراد مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افراد معاشرہ کو رزق۔۔ یعنی سامان زیست۔۔ مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا' جس میں کیفیت یہ ہو کہ۔۔ الا تجوع فیھا ولا تعریٰ۔ و (انک) لا تظمئو فیھا ولا تضحیٰ (۱۱۹۔۱۱۸/۲۰)۔۔ نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامان آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔ ولباسھم فیھا حریر (۲۲/۲۳)۔۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات۔۔ ثیابا خفرا من سندس و استبرق۔ (۱۸/۳۱)۔۔ دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے۔۔ سور موضوفۃ۔۔ مرصع اور نرم و نازک صوفے۔ افیۃ من فضۃ و اکواب کانت قواریرا (۱۵/۷۶)۔۔ چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔ غرضیکہ۔۔ نعیما و ملکا کبیرا۔۔ (۲۰/۶۷) عظیم مملکت اور اس میں سامان آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامان آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فرد معاشرہ کے لئے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جائے۔ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں۔ ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام

ان سے محروم رہیں گے۔ قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔ اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہوسکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی وطغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔۔ اور نکبت و افلاس سے پستی و دنائت کے انسانیت کش عیوب وزمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا نہ افلاس وزبوں حالی، تو ظاہر ہے کہ اس میں، ان سے پیدا ہونے والے عیوب وذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا۔۔ حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری، حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں، سازشیں۔۔ اور دوسری طرف بے حمیتی، بے غیرتی، ذلت نفس، تملق، خوشامد، منافقت وغیرہ، یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان، وجہِ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔ لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثما ۔۔اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی واضمحلال پیدا ہو۔۔الا قیلا سلاما سلاما (۲۶۔۵۶/۲۵)۔ اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشید دلنواز و آہنگ جاں افروز سناتی دیتی ہے۔۔ ونزعنا ما فی صدورھم من غل (۴۳/۷) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک وصاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں، دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریم انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا انداز وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبالؔ نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چونوش
خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب
راز دانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست
ایں بُتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر
کارہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کش دہقاں چراغش روشن است
از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجو!
حاصلش بے شرکتِ غیرے ازو!!
اندراں عالم نہ لشکر نہ قشوں
نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مَرغدیں گیرد فروغ

از فنِ تحریر و تشہیر و دروغ

نے ببازاراں ز بے کاراں خروش!
نے صداہائے گدایاں دردِ گوش!

آخر میں اقبالؔ نے اس تمام تفصیل کوایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس در آں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

ان ھذہ امتکم امۃ و احدۃ و انا ربکم فاعبدون۔ (۲۱/۹۲)۔۔اوپرایک خدا جس کی اطاعت کا قلاوہ زیب گلو اور نیچے ساری امت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔۔نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔۔ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم و النبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ (۳/۷۸)۔اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت' حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء خود ارباب نظم و نسق کی طرف سے ہوتی ہے۔اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول' قول فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ:

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی کہ

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور بہ حسن وخوبی چل سکتا ہے' جب اس کے عُمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد اُمت کا کوئی اقتدار ہوا اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا' تو اس نے اللہ' اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا' اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولائیت کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی' جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا

تھا۔ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جوان خوبیوں کا مالک ہے۔آپ اسے منتخب کرلیں۔آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا۔۔عبداللہ۔۔یہ سن کرانہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔خدا تجھے غارت کرے۔تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک تھے لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔مملکت کے مناصب' اربابِ اقتدار کے اعزہ واقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ:

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔موٹا جھوٹا کھاؤ' گاڑھا گزی پہنو' پرانے کپڑے استعمال کرو' سواریوں کو خوب چارہ دو' ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے' کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہی۔یہ عدم تحفظ (Insecurity) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد' زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہوسکتا۔اس میں' تمام افراد مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی' کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔لہٰذا' اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیرالعقول کارنامے: اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اول میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیرالعقول کارنامے کر دکھائے' اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب واحساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ظاہر ہے کہ اسمیں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔وہ زندہ رہتا ہے۔بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔(اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔۔مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور' ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے۔اس لئے اسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا' تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت

نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا' اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو۔ اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد' اس کے زور بازو کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؔ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے' تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے' چکی کے اس پاٹ۔۔ (Mill-Stone) کے نیچے بری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں' اس طرح ابھر کر باہر آتی ہیں' کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آ جاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے' محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ' وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان' معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان' کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاءؑ سے کہا کہ:

(مفہوم) اے ہمارے رسولو! خوش گوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔ (۲۳/۵۱)

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا' تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا' وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔ وکلا منھا رغدا حیث شئتما (۲/۳۵)۔۔ وہ جہاں سے جی چاہتا' پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ۔۔ یخرجنکما من الجنۃ فتشقیٰ (۲۰/۱۱۷)۔۔ وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا' جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بعضکم لبعض عدوا (۲۰/۱۲۲)۔۔ کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے' آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبی اکرم ﷺ کا مقصد: قرآن کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ۔۔ ویضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷)۔۔ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا' جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی' اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے

زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل' وہ خوف و ہراس تھا جو ''روحانی قوتوں'' کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (Complexes) پیدا ہوتی تھیں' ہماری علمی دنیا اب ان سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختم نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ۔۔انا بشر مثلکم ۔۔اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر' یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے' انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا کلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار' شرف انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے ارباب فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے' اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو' اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا' تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے' اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

> پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے' کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ'' چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔'' اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار' اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے' انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رو سے ملا تھا۔

نہ خوف نہ حزن: وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل رکھا تھا' چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر۔۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے' اس محبوس قفس طائر لاہوتی کو

آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اِذن بال کشائی دے دیا جس سے اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ۔۔لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۔۔ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔۔یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔۔ کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔۔قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے' اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا' جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا' صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی' اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالادستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے' سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکا یک سواری کو روکا۔ نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا' اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کی خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے' قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں' خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس' جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے' پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔۔قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حزن' تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ۔۔ الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ۔۔کس قدر قابل حمد و ستائش خدا (کا وہ نظام) جس نے ہمیں حزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت' تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر۔۔اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔۔ الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا

فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب (۳۵/۳۴-۳۵)۔ وہ خدا جس نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے' نہ ذہنی کاوش ونفسیاتی افسردگی' نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔۔فکر معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی' یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔

قرآن کریم (میں سورۂ فاتحہ) کی ابتداء الحمد للہ رب العالمین ۔۔سے ہوتی ہے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخور حمد وستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورت میں اسے رب الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوع انسانی کو سامان نشوونما بہم پہنچانے والا۔۔جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے' انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لئے مستحقِ حمد وستائش ہوتی ہے کہ یہ افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحق تعریف وتوصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے ارباب بست وکشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف تگ وتاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوار حمد وستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ان کے برعکس' دوسرے ارباب اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔۔ یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳/۱۸۷)۔ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے' تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ۔۔ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا (۷۶/۹)۔ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف' شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ''امام مہدی'' کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا' ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرمؐ نے' ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا' نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔ آپ نے اس سربراہ مملکت اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ۔۔یقسم المال صحیحاً۔۔وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ۔۔بالسویۃ بین الناس ۔۔تسویہ کے معنی ہوتے ہیں' کسی شے میں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔ السوی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔استوی

الرجل ۔۔کے معنی ہیں، اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔ لہٰذا مال کی تقسیم تسویۃً کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشو ونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھر پور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ عام میں کہا تھا کہ:

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں
تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اول تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت و امامت اسی کے حصہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؔ) نے یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر ہوتا۔۔

لیکن

اور یہ ''لیکن'' ایک داستان ہے جگر گداز، اور ایک حدیث ہے دلخراش۔۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ۔

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۵ سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ:

واتل علیھم نبا الذی اتینٰہ ایاتنا
تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ
جسے ہم نے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشانات
راہ عطا کر دیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ

ہوگیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رو ہوگیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولنا کیوں سے اسکی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ' تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذالک مثل القوم الذین کذبوا بأٰیٰتنا۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔۔ فاقصص القصص لعلکم یتفکرون۔۔ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ' شاید یہ اس پر غور وفکر کریں اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہوگیا۔ ساء مثل القوم الذین کذبوا بأٰیٰتنا۔ اف! کس قدر بری حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ۔۔ و انفسھم کانوا یظلمون ۔۔وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں' خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

لھم قلوب لا یفقھون بھا ۔وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔۔ ولھم اعین لا یبصرون بھا ۔وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔۔ ولھم اذان لا یسمعون بھا ۔۔ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔۔ اولٰئک کالا نعام ۔۔تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔۔ یہ انسان نہیں' حیوان ہیں۔۔ بل ھم اضل ۔۔نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔۔ اولٰئک ھم الغافلون (۷/۱۷۹)۔۔ حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا' اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

طلوع اسلام کا مقصد

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(1) تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنی رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(2) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(3) قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

(4) نبی اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(5) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

(6) رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(7) رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

(8) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(9) ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلندترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

(10) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجود ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمدگر مدغم ہو جائیں گے۔

(11) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

(12) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(13) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے

مفاہمت کرسکتا ہے۔خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو‘یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(14) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو‘یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(15) ہم‘ رسول اللہ ﷺ کے بعد‘ ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(16) طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں) نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز‘ روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں‘ ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔یہ ہے ہمارا مقصد‘ جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے‘ وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

جو حضرات طلوع اسلام کے اس مقصد سے متفق ہیں وہ اپنے اپنے شہر میں اس فکر کے عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں‘ ان کی اس تنظیمی کوشش کا نام **"بزم طلوع اسلام"** ہے۔جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں ان سے نہ کوئی نیا عقیدہ منوایا جاتا ہے‘ نہ احکام خداوندی کے علاوہ کسی اور کی اطاعت طلب کی جاتی ہے‘ نہ وہ کوئی الگ پارٹی بناتے ہیں‘ نہ عملی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں‘ نہ وہ پرویز کو اور نہ ہی کسی اور کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں نہ امیر و مطاع۔یہ ان **متفق الخیال** احباب کی تنظیم ہوتی ہے جو یک نگہی و یک جہتی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں‘ اس کے سوا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں نہ کوئی راز ہوتا ہے نہ پردہ‘ نہ ہی کسی قسم کی جلب منفعت۔

المختصر:- مسلمانوں کے قلب و دماغ سے ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات و نظریات اور معتقدات نکال کر ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا طلوع اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔اس میں وہ‘ قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو سب سے پہلے اپنے سامنے رکھتا ہے تاکہ‘ وہ مغربی سیکولرازم کے سیلاب سے بچ کر پاکستان میں صحیح قرآنی معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہوسکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حدیث کے پرکھنے کا معیار

(1) سنیوں کے نزدیک

مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

تکثر لکم الا حادیث بعدی فما روی لکم حدیث عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ۔ فما وافقہ فاقبلوہ وما خالفہ فردوہ۔

میرے بعد تم سے بڑی کثرت سے حدیثیں بیان کی جائیں گی۔ لہٰذا میری کوئی حدیث تم سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ (قرآن) کے سامنے پیش کرو۔ پھر جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کرو اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔

(2) شیعوں کے نزدیک

روی عنہم علیہم اسلام ما اتکم منا فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ۔ فما وافق کتاب اللہ فخذوہ وما خالفہ فاطرحوہ۔

(استبصار۔ جلد 3۔ صفحہ 158۔ بحوالہ ثقافت)

ائمہ سے مروی ہے کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس جو کچھ بھی آئے اسے کتاب اللہ (قرآن) کے سامنے پیش کرو۔ پھر جو کچھ کتاب اللہ کے مطابق ہو اسے لے لو اور جو کچھ اس کے خلاف ہو اسے پھینک دو۔

طلوع اسلام

احادیث کے پرکھنے کے لئے طلوع اسلام کا یہی نقطۂ نظر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابنِ عاصؔی

’’اگلا خودکش حملہ آور کون ہوگا؟‘‘

ممتاز غیرملکی تجزیہ نگار رابرٹ فسک اپنے اردگرد موجود عیسائیوں اور صیہونیوں سے سوال کرتے ہیں کہ ’’اگر حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں نازیبا فلم کی نمائش کرنے پر سینما جلایا جاسکتا ہے تو پیغمبر اسلامﷺ کی توہین پر احتجاج کیوں نہیں ہوسکتا؟‘‘ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ڈنمارک کے صیہونیوں اور عیسائیوں نے اپنے پرچم کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالتے ہوئے اس سوال پر تھوڑا سا بھی غور کیا ہوگا؟ آثار بتاتے ہیں کہ نہ ہی ڈنمارک کے ان لوگوں نے رابرٹ فسک کی بات پر کان دھرے ہیں اور نہ ہی جرمنی، فن لینڈ، اٹلی، لتھویا، آسٹریا، پرتگال اور ہنگری کے صدور نے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو یورپی کمیشن کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی ہے صاف نظر آرہا ہے کہ ان لوگوں اور ملکوں نے مسلمان حلقوں کو حقیر اور پسماندہ سمجھ کر ان کا احتجاج نظرانداز کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ ایک رپورٹ کے مطابق کئی اسلامی ملکوں نے یورپ کے ان ملکوں کے خلاف سخت اقدامات اٹھانے کا اعلان کیا ہے جن کے ہاں متنازعہ کارٹونوں کی اشاعت عمل میں لائی گئی ہے اس میں ایران نے ڈنمارک سے اپنا سفیر واپس بلا لیا ہے عراق کے وزیرٹرانسپورٹ سلام المالکی کے مطابق انہوں نے ڈنمارک اور ناروے کے ساتھ اپنے معاہدے ختم کر دیئے ہیں اور فیصلہ کیا ہے کہ عراق کی تعمیر نو کے لئے وہ ڈنمارک اور ناروے سے کسی قسم کی امداد نہیں لیں گے سعودی عرب اور شام نے بھی ڈنمارک سے اپنے سفیروں کو واپس طلب کر لیا ہے تقریباً ساری اسلامی دنیا میں اس واقعے سے غم و غصے کی لہر دوڑی ہوئی ہے سب ہی احتجاج کر رہے ہیں حتیٰ کہ ہندوستان کے وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے بھی ڈنمارک کے وزیراعظم کو خط لکھ کر کارٹونوں کی اشاعت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ اسی طرح چینی وزارت خارجہ کے ترجمان نے بھی اس کی مذمت کی ہے لیکن یورپی کمیشن والے برملا کہہ رہے ہیں۔ ’’ہم اس احتجاج اور یورپی مصنوعات کے بائیکاٹ کے مطالبے کو مسترد کرتے ہیں‘‘ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اظہار رائے کی

آزادی میں یورپ کو کھلی چھوٹ دے دینی چاہئے؟'' میں حیرانی سے سوچتا ہوں کہ دنیا سے مذہبی انتہا پسندی کے خاتمے کے لئے واویلا کرنے والے خود اس قسم کی ہی انتہا پسندی کو فروغ نہیں دے رہے ہیں؟ جس مقدس ترین ہستی کو مسلمان اپنی جانوں سے بھی زیادہ چاہتے ہیں وہ اس کی سرعام توہین کر کے ہم سے اچھائی اور بھلائی کی توقع کیونکر رکھتے ہیں؟ سال ہا سال سے اہل یورپ ہمارے مذہب اور مقدس شخصیات کا مذاق اڑا رہے ہیں بلکہ اگر کوئی فرد ہمارے ملکوں میں رہ کر ایسی گستاخی کرتا ہے تو یہ اس کو ''سیاسی پناہ'' (Political Stay) دینے کے لئے بڑھ چڑھ کر اپنے نام پیش کرتے ہیں مثال کے طور پر بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین اپنے بے ہودہ ناول ''لجا'' (شرم) میں اسلامی اقدار کا مذاق اڑاتی ہے جنسی تعلقات کے بارے میں اپنے عجیب وغریب نظریات کا پرچار کرتی ہے۔ قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) ''پرانی کتاب'' کہہ کر اس کی اہمیت کم کرنے کی جاہلانہ کوشش کرتی ہے تو مسلمان اس کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں لیکن اس کی حمایت میں یہی کارٹونوں کی اشاعت کرنے والے بھاگ کر آ جاتے ہیں جی ہاں یہی ناروے تھا جس نے بنگلہ دیش میں اپنے اس وقت کے سفیر کو اس عورت سے فوراً رابطہ کر کے سیاسی پناہ دینے کی پیش کش کرنے کا حکم دیا تھا اور یہی ڈنمارک تھا جو اسلام کا مذاق اڑانے والی اس عورت کی جان بچانے کے لئے انتہائی سرگرم نظر آتا تھا اور انہی دنوں برطانیہ کے انسانی حقوق کے کمیشن نے اپنے اردگرد کے تمام ''دوست'' ملکوں سے تسلیمہ نسرین کی مدد کرنے کی اپیل کی تھی اور امریکی اخبار ''واشنگٹن پوسٹ'' تسلیمہ نسرین کی خاطر پوری دنیا کے مسلمان ملکوں کی مخالفت مول لے رہا تھا کل بھی یہی لوگ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور آج بھی یہی لوگ ایسا کر رہے ہیں اور اب تو ان کی مجبوری ہے کیونکہ اس بار ''مجرم'' ان کی ''برادری'' میں سے ہیں سو یہ مسلمانوں کو حیلے بہانوں سے احتجاج نہ کرنے کا درس دے رہے ہیں۔ طرح طرح کی ترغیبیں مل رہی ہیں لیکن مسلمانوں کے اندر ایک جوش اور ایک جذبہ پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈنمارک کی کئی بڑی کمپنیوں کو ان چند دنوں میں کروڑوں ڈالرز کا نقصان ہو چکا ہے۔ ناروے، نیوزی لینڈ اور ڈنمارک جیسے ملکوں کے شہریوں کی زندگیاں خطرے میں دیکھ کر انہیں فوراً حفاظتی اقدامات کرنے اور مسلمان ملکوں میں نہ جانے کی ہدایت حکومتی سطحوں سے کی جا رہی ہے لیکن ذرا سوچئے اگر دنیا کے ساٹھ سے زیادہ ملکوں نے یورپی مصنوعات اور ملکوں کا بائیکاٹ کر دیا تو ان پر کیا بیتے گی؟ آج بحرین کی پارلیمنٹ یورپی مصنوعات کے بائیکاٹ کی قرارداد منظور کر رہی ہے تو کل باقی مسلمان ممالک بھی یہی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں تو کیا یورپی ممالک کو اپنے غیر ذمہ دار اخباروں کو بازنہیں کر

لینا چاہئے؟ بات بگڑنے سے پہلے پہلے ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہوگا کیونکہ مسلمانوں میں ایک عرصہ سے یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ جس دہشت گردی اور انتہا پسندی کا سہارا لے کر مسلمان ملکوں پر یلغاریں کی جا رہی ہیں دراصل وہ تو ان میں کہیں ہے ہی نہیں' جو چند لوگ نظر آتے ہیں ان کی ''ڈوریں'' بھی کل تک امریکہ اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں میں ہوا کرتی تھیں اور اگر آج یہ لوگ "Most Wanted" بن چکے ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ''آقاؤں'' کے ہاتھوں میں مزید کھیلنے سے انکار کر دیا ہے اور اپنے لئے اپنے میدان سجا کر اپنے گھوڑے اپنی مرضی سے دوڑانے شروع کر دیئے ہیں۔ یہ گھوڑے کب تک دوڑتے ہیں یہ تو پتہ نہیں ہے لیکن یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ اب ہر طبقہ کے مسلمانوں میں ایک اشتعال پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ گذشتہ دنوں ایک ریٹائرڈ جرنیل نے کہا ہے کہ ''اگر اسلام کی توہین یونہی جاری رہی تو اگلا خودکش حملہ آور میں ہوں گا۔ ایک جدید تعلیم یافتہ فرد نے ایسی بات کیوں کہی؟ یہ بات اہل یورپ کے سوچنے کی ہے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل

ناموس رسول ﷺ پر گستاخانہ حملہ

عالم اسلام کی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ جو کارٹون ستمبر ۲۰۰۵ء میں چھپے تھے ان کے بارے میں انہیں یورپ کے دیگر اخبارات کے دوبارہ چھاپنے پر فروری ۲۰۰۶ء میں معلوم ہوا۔ اس حرکت سے بلاشبہ ہر مسلمان کو بے حد دکھ پہنچا ہے۔ اس پر مختلف قسم کے ردعمل سامنے آئے ہیں اور کچھ سیاستدانوں اور نیم مذہبی رہنماؤں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا رخ پر تشدد مظاہروں کی طرف بھی موڑ دیا ہے جس میں اپنے ملک اور اپنے ہی بھائیوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ جن ملکوں کے اخبارات نے یہ کارٹون چھاپے ہیں وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ کی متعدد ویب سائٹس پر اسلام، نبی کریم ﷺ اور حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جنہیں پڑھ کر جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس شخص کا منہ نوچ لیا جائے لیکن کس کس کو اس طرح روکا جا سکتا ہے۔ اور جذبات میں آ کر اپنے ہی ملک کی املاک کو نقصان پہنچانا بھی تو عقل مندی نہیں ہے۔

انسانوں کی اکثریت ہر معاملے میں جذباتی ردعمل ظاہر کرتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی کے لئے قرآن کریم میں ایسے اصول دے دیئے ہیں جو کسی بھی مسئلے کا بہترین حل ہوتے ہیں چاہے کوئی انہیں پسند کرے یا نہ کرے۔ زیر بحث مسئلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی مثال دی ہے کہ اس سے برتر کوئی انسان نہیں ہوسکتا چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔

ارشاد باری ہے:

> ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم کذٰلک زینا لکل امۃ عملھم ثم الیٰ ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعملون (الانعام۔۱۰۹)۔
>
> ''ان کے معبودوں کو جنہیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں گالیاں نہ دینا۔ یہ نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگ جائیں۔ ہر کوئی اپنے عمل کو صحیح سمجھتا ہے۔ انہوں نے اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے اور وہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

افسوس ہے کہ ہمارے نام نہاد مذہبی رہنما اسلام

کو بطور مکمل نظام متشکل ہونے نہیں دیتے اور اس کی راہ میں روکاٹ بنتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے مفادات پورے نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اسلام کی جو شکل یہ پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی تعلیمات سے ٹکراتی ہے' جس کا نتیجہ اچھا نکل ہی نہیں سکتا۔ جب تک اسلام ایک نظام کے طور پر قائم نہیں ہوتا یہ لوگ بزعمِ خود اس خلا کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جو کچھ یہ لوگ اسلام کے نام پر پیش کرتے یا جس پر عمل پیرا ہوتے ہیں، دنیا اسی کو اسلام سمجھتی ہے۔ انٹرنیٹ پر جب ان لوگوں کو جو اسلام کے خلاف باتیں کرتے ہیں یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام وہی ہے جو قرآن کریم میں ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی کو اسلام سمجھیں گے جو تمہارے مذہبی لیڈر پیش کرتے ہیں۔

آپ گزشتہ چند ماہ کے اخبارات اٹھا کر ہمارے مذہبی لیڈروں کے بیانات پڑھیں، ان میں سوائے دھمکیوں کے اور کچھ نہیں ملتا۔ کبھی پاکستان کی حکومت کو دھمکیاں کبھی امریکا کو اور کبھی یورپ کو۔ ان دھمکیوں کی موجودگی میں دنیا کو کیسے باور کرایا جا سکتا ہے کہ اسلام امن کا پرچار کرتا ہے؟ اگر حقیقی معنوں میں کسی اسلامی مملکت کا وجود ہوتا تو وہ قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق امت واحدہ کی ترجمان ہوتی اور اتنی مضبوط ہوتی کہ وہ ساری دنیا میں امن قائم کرنے کی ضامن ہوتی۔ متعدد ملکوں میں بٹے ہوئے اور سینکڑوں فرقوں میں منقسم مسلمانوں کا دنیا میں جو مقام ہو سکتا ہے وہ سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ اگر تنازعات میں پڑے رہو گے تو ناکام ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (۸:۴۶) ایسے میں ان لوگوں کی دھمکیوں کا دنیا پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مروجہ اسلام کی بنیاد اللہ کی کتاب کی بجائے کتب روایات پر مبنی ہے۔ جب تک ہم قرآن کریم پر ان کتب کی بالادستی قائم رکھیں گے' دنیا کو کبھی قائل نہیں کر سکتے کہ اسلام امن کا ضامن ہے۔

لہٰذا اگر ہمارے مذہبی رہنما فی الواقع ناموس رسالت ﷺ پر حرف نہیں آنے دینا چاہتے تو انہیں اسی اسلام کا پرچار کرنا اور غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنا ہوگا جو قرآن کریم کے مطابق ہو اور اسی کے مطابق تمام مسلمانوں کو فرقوں سے نجات دلا کر امتِ واحدہ بنانے کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری مانچسٹر

ختم نبوت اور افتریٰ

سورۃ الانعام میں قرآن کریم کے متعلق ہے کہ یہ بڑی بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ یہ اس تعلیم کو سچ کر دکھانے والی ہے جو اس سے پہلے دی گئی تھی۔ (اے رسول ﷺ) تم اس کے ذریعے (پہلے) اس مرکزی مقام (مکہ) اور اس کے گردوپیش کے باشندوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو۔ اس پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جو زندگی کو اسی دنیا کی زندگی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے بعد کی زندگی کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ موجودہ غلط نظام کی جگہ ایک صحیح نظام آ کر رہے گا۔ اس مقصد کے لئے یہ لوگ خدا کے مقرر کردہ نظام الصلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں (۶/۹۳) آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں' جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان بالقرآن کی بنیاد خدا کے قانون مکافاتِ عمل پر ایمان ہے۔ قرآن میں اس قانون کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس لئے ایمان بالقرآن اور ایمان بالآخرت لازم و ملزوم ہیں۔ ہمارا نہ قرآن پر ایمان ہے نہ آخرت پر۔ یعنی نظری طور سے ان الفاظ پر ایمان ہے' ان کے مقصود و مطلوب سے نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت تمام نوعِ انسان کے لئے تھی اس کا آغاز حضور ختمی مرتبتؐ نے اپنے اقربا سے کیا۔ اس کے بعد اس کا دائرہ مکہ اور اس کے گردونواح تک وسیع کر کے پوری کی پوری قوم کو مخاطب کیا گیا اور یہ سلسلہ قوم کے دائرہ سے بھی آگے چلا گیا۔ ختم نبوت کے بعد یہ سلسلہ امت محمدیہ ﷺ کی وساطت سے آگے بڑھنا تھا یہ سلسلہ ایک وقت تک جاری رہا اور اس کے بعد اس کے بعد ہم آ گئے جن کا خود اپنا ہی قرآن پر ایمان نہیں۔ لیکن قرآن کا پیغام نہ کسی خاص قوم تک محدود ہے نہ کسی خاص خطہ ملک تک محصور۔ یہ تمام انسانی کے لئے ضابطہ زندگی ہے' اور قرآن کے دعویٰ کے مطابق اسے دنیا کے تمام ضوابط پر غالب آ کر رہنا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ وحی صرف انبیاء کرام کو عطا ہوتی ہے۔ غیر از نبی اگر اس کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کاذب اور فریب کار ہے۔ اس آیت کے پہلے جز میں کہا گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر سنگین مجرم کون ہوسکتا ہے' جو اپنے ذہن سے باتیں وضع کرے اور انہیں منسوب کر دے خدا کی طرف یعنی اپنی طرف سے وضع کردہ عقائد و احکام کو شریعت خداوندی کہہ کر پیش کرے۔ لہٰذا اس رسول ﷺ کی موجودگی میں یا اس کے بعد یہ دعویٰ کہ مجھے خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے' کذب وافتریٰ ہے (القرآن ۶/۹۴)۔

(بشکریہ جنگ لندن)

نغمۂ ربوبیت

مصنف وجدانی

عزۃ القرآن جلد دوم کا ایک ورق

جہاں کچھ دھندلا دھندلا ہے، ضیا کاری کا وقت آیا
بھری محفل میں سناٹا، صدا کاری کا وقت آیا
ربوبیت کی خاطر اب، فداکاری کا وقت آیا

ربوبیت ہے زیرِ آسماں، اسباب رحمت سے
نہ ہوں جو یہ، تو انسانوں پہ ناداری کا وقت آیا
ربوبیت کی خاطر اب، فدا کاری کا وقت آیا

خدا کی یہ زمیں احسانِ ربانی سے زندہ ہے
یہاں للارض للہ کی، صدا کاری کا وقت آیا
ربوبیت کی خاطر اب، فدا کاری کا وقت آیا

نہیں ہے غربت و افلاس انسانی مقدر میں
زمانہ پھر بدلتا ہے، کہ بیداری کا وقت آیا
ربوبیت کی خاطر اب، فدا کاری کا وقت آیا

غریقِ مال و زر ہونا، نہیں شرطِ مسلمانی
امانت ہے یہ ملت کی تو انصاری کا وقت آیا
ربوبیت کی خاطر اب، فدا کاری کا وقت آیا

غریبی مٹ نہیں سکتی خودی کو چھوڑ دینے سے
گداؤ ''توڑ دو کشکول'' خود داری کا وقت آیا
ربوبیت کی خاطر اب، فدا کاری کا وقت آیا

جہاں انفاقِ مال و زر سے ہو خدمت یتیموں کی
یقیں جانو، وہاں، العفو سے یاری کا وقت آیا
ربوبیت کی خاطر اب، فدا کاری کا وقت آیا

''تشیع الفاحشۃ'' کا زور ہے مٹنے مٹانے کا
ہٹا دو نیم عریانی، حیا داری کا وقت آیا
ربوبیت کی خاطر اب، فدا کاری کا وقت آیا

قراردادِ تعزیت

ناوک نے تیرے تیر وہ مارا کہ ہائے ہائے

ماسٹر عبدالعزیز مرحوم سابق نمائندہ بزم طلوع اسلام پنج کسی ۱۴ فروری ۲۰۰۶ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات کی خبر بجلی بن کر گری جس نے سنا سکتے میں آ گیا۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ عبدالعزیز! وہ تو سب کو عزیز تھے۔

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

موت کی یہ ارزانی ہم سے ہمارے عزیز کو دور لے گئی۔ لیکن اس کے بے رحم ہاتھ ان کی خوشگوار زندگی کے نقش ہم سفروں کے دلوں سے محو نہیں کر سکے گی۔ مرحوم ہماری بزم کے سرگرم نمائندہ تھے بلکہ پوری تحریک طلوع اسلام کے لئے ایک جرأت مند ترجمان اور سفیر بھی تھے۔ وہ گرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو بھی تھے۔ ان تھک، محنتی اور فکر قرآنی کے جذبہ سے سرشار تھے۔ آپ قرآنی نشر و اشاعت میں نمایاں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کے شاگردوں کی ایک خاصی تعداد ان علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ مرحوم ہماری بزم کے (علاوہ درمیان کے چند سالوں کے) ۱۹۸۶ء سے وقتِ وفات تک نمائندہ رہے۔ اراکین بزم بالخصوص اور تحریک قرآنی بالعموم ان کی جرأت رندانہ اور بے لاگ رائے سے محروم ہو گئی۔ جس کا ازالہ ہمارے لئے بہت دشوار ہے اس کے ساتھ اراکین بزم ہذا کو یہ احساس بھی دامنگیر ہے کہ مرحوم کے پسماندگان میں کوئی فرد فی الوقت ان کی گراں بار ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے قابل نہ ہے۔ اس لئے یہ صدمہ ان کے لئے بہت بھاری اور جگر گداز ہے۔

ہم انشاءاللہ ان کے اس غم میں انہیں سہارا دینے کا عہد کرتے ہیں اور اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے اس دکھ اور غم والم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ انہیں ہمت اور حوصلہ دے کہ وہ اپنے پاؤں پر مستحکم کھڑے ہوسکیں اور مرحوم کی امنگوں آرزوؤں کی تکمیل کرسکیں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

اراکین بزم ہذا دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

جملہ اراکین بزم طلوع اسلام پنج کسی، تحصیل کبیر والا ضلع خانیوال۔

Allama Iqbal & Ghulam Ahmed Parwez on the creeping of Non-Arab (Ajami) ideas into Islam

By

Agha Shorish Kashmiri

==========

[While reading the January 2006 issue of Tolu-E-Islam, I came across a review of the Late Shorish Kashmiri, Editor of the weekly Chattan-Lahore, on the well-known book of Mr. Ghulam Ahmed Parwez, Shah Kar-e-Risalat - the biography of Caliph Hazrat Umar Farooq. This review is brief but provides a deep thought provoking glance of the deliberations of Allama Mohammad Iqbal and Mr. Ghulam Ahmed Parwez on the creeping of the non-Arab (Ajami) ideas into Islam. I present its English translation for general public benefit. ***Abdus Sattar Ghazali, California, USA.]***

Allama Iqbal, in his 5th lecture on the Reconstruction of Religious Thought in Islam, says that this is not the way to prevent the decay of a nation that we give undue reverence to our previous history or try to recreate it through artificial means.

Allama (Iqbal) wrote in a letter to Chaudhry Mohammad Ahsan (See Iqbal Nama):

'In my view the Ahadis related to Mehdiate and Christianity are the result of Iranian and non-Arab thoughts. They have no relations with the Arabic thought and the true Quranic spirit.'

In another letter to Molvi Sirajdin, Allama says: For several centuries, Muslims of Hindustan are under the influence of Iranian thought, they don't have any exposure to the Arabic Islam, its objectives and mission.

Yet in another letter to Dr. Syed Yamin Hashmi, (See Anwaar-e-Iqbal compited by Bashir Ahmed Dar, P 192-193), Allama points out: 'In my view, non-Arab thoughts are responsible for the destruction of Muslims in Asia. It is the duty of every Muslim to struggle (Jihad) against this. The influence of non-Arab thought is on religion, literature and day to day life.'

In another letter to Mohammad Deen Fouq, Allama says: 'Arab Islam is a forgotten thing in Hindustan.' (Anwaar-e-Iqbal p-66)

This line of Armaghan-e-Hijaz reflects this deep historical sense of Allama:

Ajam hunuz na danad ramuz-e-dein warna

(Non-Arabs still do not know the secrets of religion otherwise…

The expectation from the above quotations was that the scholars of Iqbal should have written on this subject. They should have reviewed the impact of non-Arab thought on Islamic writings. Ironically, none of the Iqbal scholars thought about it or removed the biggest obstacle in the renaissance of Muslims. Most people believe that they were not capable of this, while some others had no courage because of financial or worldly interests.

****

Two days ago, in the company of Maulana Taj Mehmood of Lyallpure, I met with a friend and the issue of non-Arab thought came during our discussion.

This friend referred to the latest book of Mr. Ghulam Ahmed Parwez, Shah Kar-e-Risalat (Umar Farooq) and recommended that this book is a must read for all scholars.

This book details and unveils all the non-Arab conspiracies that have been mentioned in the above-referred letters of Allama Iqbal. This big size book has 528 pages. In the 14th chapter of this book, about 100 pages detail non-Arab conspiracies, which is the gist of several thousand pages of history. This exhaustive chapter may be described as an independent and comprehensive book. Detail of every sub-topic is given. Hence no question remains unanswered.

These discussions provide answers to almost all questions that come into mind. Eventually, an inquisitive mind also finds some new points of thought.

****

As far as the whole book is concerned, the scribe has not yet gone through it. Only chapter 14 is read. Obviously, a critique of the book can be written only after the study of the whole book, but after the study of the 14th chapter, I felt that:

(1) Through his pen, Parwez has highlighted the intellectual concern of Iqbal related to non-Arabs (thought) through historical facts.

(2) As I said earlier, it is difficult to give opinion about the whole book before its reading, but I dare to say that the 14th chapter is an analytical story of the political and intellectual difficulties in the history of Islam. It is the story of the plight of Islam at the hands of the whole non-Arab.

(3) Some prominent Ulemas and scholars may disagree totally or partially on certain issue or aspect; however the scribe has noticed a pleasant change in his jaundiced opinion about Parwez that was formed by the Fatwas of Ulemas.

Overall, leaving aside severe political extremism and personal prejudices, I will say that Parwez thinks with an Islamic historical perspective about the renaissance of Islam. His heart is in turbulence because of distortion in the history of Islam. He addresses the new generation on the basis of modern thought in order to remove its confusion.

(4) Discussions in the under review chapter has the following subjects:

- What was the secret of Muslims' power?

- Beginning of the hidden (Secretive) movements to distance Muslims from the Quran and its consequence.

- Vanquishing of Iran and Romans and the differences between these victories.

- Embracing of Islam by the special unit of Yazdgar.

- Iranian reaction after the Qadsya battle.

- Migration of Iranians to Kufa and Basra.

- Two prominent fronts of non-Arab conspiracy.
- Jugglery of traditions.
- The issue of khalafat.
- Political implications of the right of inheritance (of power).
- The concept of Iranians about their kings.
- Abdullah Ben Sabah.
- The faith of the return of Masih or Mahdi.
- The concept of Imamat, according to Ahadith.
- Distinction between belief (eemaan) and disbelief (kufr).
- Hazrat Salman Farsi.
- Tussle between Banu Umayya and Banu Abbas.
- Sadats and Alvis.
- Abu Muslim Khorasani.
- Brameka
- Walemi (Bani Boya) government
- The Shia period of Baghdad.
- The end of Abbaside period.
- After how long the Iranians took revenge of the Qadsia battle.
- The foundations of Islam.
- Different sects and their fabricated ideologies.
- Distortion of the Quran.
- Hidden meanings.
- The concept of Muhaddith (appearance of a reformer).
- Collectors of Hadith.
- Impact of non-Arab belief on Sunnis.
- Doubts and misconceptions about collection of the Quran.
- The status of Hadith.

- Who was Ibne Jarir Tabri?

- Islam was no longer “deen” but became religion (meaning of the Quranic verses related to Khalafat changed).

- Separation of religion and politics.

- The end of the possibility of legislation (or interpretation as Shafei school declared that all laws are present in ahadith).

- Revival of the capitalist system.

- The concept of fate.

- The reality of mysticism (sufisim).

- Ibn-e-Arabi.

- The foundation of mysticism.

- Authority for the hidden knowledge (to Imam or Mohaddas).

- Attack of non-Arabs on Jehad.

- Cure of those ailments which have been inflicted on the Muslims collectively.

(5) An atmosphere has been created about Parwez in the religious circles persistently that he does not believe in Hadith. But he clarified his belief in a very lucid way, after which, in my view, this issue has been resolved.

This scribe is justified in asking the Ulama that:

- Imam Bukhari collected 600,000 ahadith and after sorting them out he kept only 2762 in his collection.

- Imam Muslim found 300,000 ahadith and trusted only 4348.

- Imam Tirmizi collected 300,000 and kept only 2115.

- Imam Abu Daud collects 500,000 and keeps only 4800.

- Ibn-e-Maja collected 400,000 and kept 4000.

- Imam Nisai collected 200,000 and trusted 4321.

Then what is the reason that Parwez’s character is being assassinated on the accusation that he does not believe in Hadith?

Parwez does not recognize those Ahadith which are against the teachings of the Quran and which have no connection with the sayings of

the Prophet (PBUH). Such Ahadith were fabricated to serve the interests of kings after the end of Khilafat-e-Rashda (The period of the first four caliphs); or non-Arab conspiracy attributed them towards the Prophet (PBUH).

Our Ulama, through their barrage of attacks, cannot ignore this important issue which is the current topic of the history of Islam and crops up in our new generation's mind. On the other hand this is not an issue of kufr (disbelief) and Islam.

What is the thinking of the new generation? Parwez represented this thinking and removed the pile of non-Arab dust from Islam through his intellectual endeavour.

Some people may not tolerate this. But it is not appropriate that knowledge may be stalled or blocked through angry accusations.

(6) Mr. Parwez, in this chapter, also gave explanation about his belief. He says:

'I am neither Sunni nor Shia. I am not related to any sect. I am a student of the Quran. My belief, rather my conviction is that this great book of God is the only authority for Deen. It is the only standard to distinguish between right and wrong (truth and falsehood). In my view, any belief, ideology, idea, school of religious thought that is contrary to this (book i.e. Quran) is not right, despite the fact that this (belief etc.) is attributed to any of our respected elders. If any of such belief is attributed to any of the respected elders, who belong to any sect, I will humbly say that such attribution does not seem to be true. They might not have said this.' P-499

After this explanation, there is not justification for a campaign against Parwez. The saying of any prominent religious personality which is contrary to the Quran has no value and it is obligatory on a Muslim that he should reject this.

Shahkar-e-Risalat, is an excellent book from the point of view of topic and printing. Its reading stimulates thinking and opens new channels of thought. It is a book about the exemplary and commendable Islamic political system.

In the words of Allama Iqbal, he wished for the realization of this system in his life.

The biography of Muslim mind may be the most appropriate name this book.

Ae Zouq Is Jahaa'n Ko Hai Zeib Ikhtalaf (Zouq, Diversity if beauty in this word).

We have differences with Mr. Parwez on several issues, about after reading this book, we found great respect for him.

Whatever Iqbal aspired to say about non-Arabs (distortion of Islam), Shahkar-e-Risalat is actually an intellectual and historical embodiment of this wish.

Take back Fatwa against Parwez

Editor Chatan is not privileged to meet Mr. Ghulam Ahmed Parwez personally, but after reading his great book Shahkar-e-Risalat, the editor of Chatan is convinced that this book will prove an asset in hereafter for him. Allah will place Parwez with those Ulama who dedicated their lives to Islam in every period.

Every human being commits mistakes. May be at any point his pen might have erred. But there is no doubt that he is a sincere Muslim. He is a great scholar of the Quranic thought.

I emphatically appeal the Ulama that they should not become victim of petty controversies and must read Shahkar-e-Risalat.

In view of Ulama's learned opinion, if Mr. Parwez has committed any mistake about religion, he should be politely informed so that his sincere mind can re-evaluate its shortcomings.

However, the fact of the matter is that in the Karbala of Islamic thought, Parwez is also a voice of the Hussaini Caravan. And Ulama should take back their Fatwa against him.

[Published in the May 13, 19974 issue of the weekly Chattan-Lahore.]

==========

Secularism, Theocracy and Islamic State

By

Abdul Rashid Samnakay, Australia

==========

The purpose of this article is to examine the concept of 'Islamic State' and compare the other two terms 'Secularism' and 'Theocracy' in the context of governing a country. Copious material is available in print form and Cyber space on the subjects, where though, Islamic State is mistakenly juxta positioned with Theocracy.

Theocracy is governance of a State on the basis of rigid religious dogma. It is emphasised here that, 'Islamic State' and Theocracy are not one and the same thing and are not therefore synonymous concepts. The antonym of which is Secularism.

Secularism is understood to be a system of ruling the civil society without any interference of the established institution of Church (here the word is used as a generic term for all religious institutions based on mosques, temples, synagogues, Christian-church etc) in the governing of the country. Additionally there is the implication in Secularism of a clear demarcation of responsibilities between the State governing the country through its bureaucracy and the Church taking care of the morality of the citizens through its operatives, the Clergy.

In the Theocratic system, a group of elite people are the custodian of 'Power' because of their alleged proximity to their respective deity, and are therefore often not included in the civil society, which has nothing or very little to do with their appointments. It is thus a State within a State.

For the sake of this argument, it is essential to differentiate between 'Religion' of Muslims and 'Deen' of Islam. Deen is variously interpreted as 'way of life', a 'complete system' to regulate community and individual life. Because, 'life' encompasses the total manifestation of

'living' and politics impinges on the living in every way, of which the operative system is Deen. The word 'system' is therefore preferable to express the all inclusiveness of Deen of Islam compared to 'Religion', which is dogmatic and its rituals are formulated by the institution of the "Church" to be administered by its operative the "Clergy".

In modern times, 'Secularism' is recognised to be the panacea of all political ills, where as Theocracy is the source of all ills because of its fundamental rigidity (fanaticism) of dogma. Hence in common understanding, 'Islamic State' is supposed to be the worst of the worse, for it is considered to be based on Religion and more often than not is designated 'Fundamentalist', really meaning 'fanatic'!

In modern history the process of egalitarian reform could be said to have its seminal origin from the Magna Carta, a document of 1215 CE where England's King John's absolute Power, the God's representative on Earth was divested down to a few noble men. The document signed by the thirteen American Colonies declaring their independence in 1776; the French revolution resulting in the country becoming a Republic-1792; the Russian October revolution of 1917 and many more struggles in recent times where Government powers were handed down to the former colonies, were the building blocks for the beginning of modern reforms. The age of enlightenment had dawned and people power was recognised, hence the preference for Secular Democracy.

But its custodians, on personal basis, often under the carpet, always claim allegiance to some or the other 'Religion' and through the institution of Church overtly or covertly influence the system of governance of the country. The church thus imposes its values and morals on the State even when the authority is vested broadly in the elected parliament, wherever Parliamentary democracy has evolved.

But for the puritan Secularist however, for example the National Secular Society-UK, any trace of religious imposition is uncalled for and complete "separation of Church and State' is touted as highly desirable. But the hold of religion is still very strong even in the best of the so called

Secular States. Many a Kings and Queens and Presidents in the world are still crowned in 'Churches', sitting, standing and holding a holy scripture, symbolic religious icons and those inaugurated in authority swear their oaths in the name of one or the other Deity.

Only recently the Supreme Court of USA, in a lengthy contested case authorised the display of Ten Commandments in public place because they were the basis of making the US Constitution, in spite of -- "Congress shall make no law respecting an establishment of religion". Never the less "in God we trust" reigns supreme in every aspect of America.

Not even the Republic of France, which is a model of Secularism. Napoleon, to add prestige to his coronation, persuaded Pope Pius VII to attend and crown him, but then crowned himself Emperor by taking the crown from the Pontiff's hands. Thus he thought creating a win-win situation for Secularism and Theocracy. In United Kingdom the Queen is the head of the Church of England and Defender of the Faith and also head of State. Not many countries in the West have openly declared them selves as Religious States. Spain has done so to name one.

Islam and Muslims-

The so called world view of Islam is, that it is a religion same as all others, has rituals, rites of worship, right of passage etc. Generally it is considered a dogma of Spirituality. Muslims are misogynist, and not *Westernised,* therefore from underdeveloped regions of the world. Since 9/11 also add to the list of negatives, militant and source of terrorism, and its origin being a desert area in the Middle East, populated by backward people but rich in OIL wealth etc!

With this picture in mind, many in the West, particularly its religious conservatives, that is Fundamentalists, are not prepared to accept Islam as a monotheistic faith, a doctrine laid down from divine authority having its geneses in the Judeo-Christian faith. There being nothing in common between the two, except for fundamentalism, it is therefore a one-way

traffic for the ordinary Muslims to establish kinship with them and so it is an uphill battle for them to integrate in the so called Western civilised world.

To compound the felony, the deep split that exists amongst Muslims themselves, initially as a result of political disagreement, over more than a thousand years now, is of the extant that there are groups within it, expressly monopolising the factions for themselves and expelling the others out of its fold. The rancorous divisions of Shia and Sunni is an obstacle in presenting Islam as a monolithic block. Although the same is true of most of the other major religions, but the fact that they each have a central Body, lessens the negative impact. Compare for example the Pope, the English Queen, the Dalai Lama, with the Ayatollahs of Iran and the Saudi Kingdom, both claiming to be the custodian of Islam! The Muslims therefore are not considered as part of the larger community of the enlightened world, that is to say the industrialised and technologically advanced rich world.

Islamic State

It is universally accepted that the source of Islam is the book called Qura'n. Thus the composite identity of this community (*Ummah*) is the crux of the matter in deciding who is 'of us' and who is 'amongst us' in a country run on Islamic precepts of the Quran, stemming from the verse- *As to those who split your Deen and break up into sects, you (Muhammad), have nothing to do with them in the least…6-159.* This injunction of "coherence" of its community is repeated at various places in the Book. The freedom of thought is there, but with the proviso that there must not be acrimony in the matters of Deen.

Having given this composite identity to its people, it expects that the State rules its citizens within the framework of that unity. It also maintains that the Rulers are themselves members of this composite community, and not an ELITE separate from the civil society, as is the case with Theocracies, Monarchies and Autocracies. Elitism of all sorts is a taboo. This elitism of the Ruling-class where Power is vested in the hands

of a few, is frowned upon. Additionally an individual is not considered a pious and a 'good' member of the community in his/her isolation and therefore cannot act out side that framework when in power. Hence mundane morality/immorality of the individual cannot be separated out side the frame. In such a system, Politicians committing crimes for political expediencies, WMDs in Iraq for example or committing individual crimes, ARE 'criminals' and not just Political Delinquents. And Fridays, Saturdays or Sundays are not Sabbath days only for obtaining God's absolution. To quote Hasan al Banna (1906--1949):

"When asked what it is for which you call, reply that it is Islam, the message of Muhammad, the Deen that contains within its Government, and has one of obligation of Freedom. If you are told you are *political* (italic are mine), say that Islam admits no such distinction".

Minorities in the State (those amongst us but not of us)

The definition of an Islamic State hinges upon the answer to the question of rights of minorities within it. What is the status of minorities in an Islamic state? For answer we must look at the underlying injunction in Qura'n, which for Muslim state/society is that humanity as a whole is *worthy of Dignity*. And that Freedom, Justice, Equality (including gender) and Security etc are essential rights to maintain that dignity. Hence all the citizens of a Muslim country including those 'not of us' must be guaranteed these rights by the State and its society.

The Book establishes that those who 'believe' in its Deen are of the *nation of Abraham* (Ibrahim) 2-135, and all those are Muslims. Its 'Islam' is therefore inclusive of people of the book and not only specific to the believers in the message of Muhammad, for his message is, as was of all previous messengers', universal. That is the creed of Islam.

But if Yahood (Jews), Nasaaraa (Nazarites, Christians) and the others maintained their 'religious values' separate from those values that Islam endorses, then it must stand to reason that they are 'amongst us'

but 'not of us' and Qura'n therefore warns of the danger that lurks there-in of such 'partisanship' 30-32. Such partisanship could be against the interest of the Islamic State and therefore endangering its security, hence those 'amongst-us' cannot share the governing Power! Values held in religious frame work if different from that of the State causes rancour. Professor Jared Diamond agrees in his book 'Collapse: How Societies Choose to Fail or Succeed (Penguin)', says "Religious values are especially deeply held and are often the cause of disastrous behaviour". Hence those 'not of us' can work 'for us' but not share in the State Power. One assumes that this is what Queen Victoria meant when she proclaimed (1858) in the context of British Raj of India-" … our subjects, of what ever race or creed, be freely and impartially admitted to office in our service, the duties of which they may be qualified by their education, ability, and integrity duly to discharge". The corollary being that no Indian will ever become viceroy of India, let alone the queen or king of British Imperial India.

Similarly the question arises as to where in lies Democracy in an Islamic State? As argued above, equality and justice are rights and preservation of security must be guaranteed in an Islamic State. In Islam, democracy- government by people- and government by consultation are not mutually exclusive. What is argued here is that, democracy as understood in the West, that is majority of ONE or even of the FEW, can not always be compatible with equality and justice, as so often is proved in modern day elections round the world (Tyranny of the Majority?). I therefore believe that Sukarno's "guided democracy" has merit in the evolving maturity of a developing country, which almost all of the Muslim countries are today. Surely there is more than one way to get people 'involved (*shuaraa)*' in the democratic process!

Mr M A Jinnah, the founding Father of Pakistan, well understood the difference and had summarised for the 'Islamic State' (August 11,1947 address to the Constituent Assembly of Pakistan). It is said that he never used the word Secularism for Pakistan. But he is on record of having declared that he was 'against setting up a theocratic state under mullah

rule', echoing exactly what Diamond expressed above**.** Obviously Jinnah meant to laicise the government's administrative process to the 'lay' public. Unlike Kamal Ata Turk, who came from Naqshbandi 'religious' early schooling in Turkey and wanted to set up an European style Secular State; Jinnah was not a product of religious upbringing in any sense; but had acquired much better understanding of the Deen in latter life, and wished for an Islamic State. Pakistan was not created as a Religious State.

Following the arguments above, it is perhaps appropriate to designate the present day Islamic States rather as Muslim Majority States, for just that their population is largely Muslim. Similarly all the other governments in the world are majority States, for they all have some form of ethno-religious bent and are therefore Theocratic States under the carpet. None fit the description of Secular State given above. They are all based on Elitism or 'religious values' or both. Communist Russia tried Secularism and failed, for bureaucratic elitism was equally rife there since 'some were more equal than others' and Orthodox Church is deeply rooted in the Russian psyche!

The Islamic State is therefore neither Secularist nor Theocratic as explained here, nor is it 'some thing in the middle' as alleged by the apologist of the designated Islamic States. Equally to interpret an Islamic State in the timeframe of its 'past', or historic 'traditions' is also to limit its scope. The ability of the Government to change policies and adapt to the age by adhering to the universal values, which are the same as to days Universal Human Rights values of to day, is an Islamic State. In the phraseology of verse13-17 *while that which is for the good of humankind remains on the Earth* is Islamic State*.* In the total context of the Book, unfortunately, all Muslim majority States fall short of its teaching.

Note: The claim of the Quran is that even if humans do not accept the Book, the challenges of life and time will bring them to the same conclusions, Only it will be a prolonged and painful period. The Quran economises time and effort. (Editor)

==========

A HOLY JUNGLE

By

Aboo B. Rana

==========

Life is a movement that appears to be running against the directions of main currents of nature. The scientist in us, after peeping through his tiny and small telescopes becomes bewildered. Seeing galaxies and stars getting along fine and doing well without any form of life or brain in them. Human life, comparatively speaking is a recent arrival, which stepped into the universal arena and made its debut! They say it happened several hundred million years ago. Not knowing how to survive in the uncomfortable corner in this universe that was provided to human being, life began struggling to make use in surprising manners, of the energy and elements around it. Surprising manners? Since human life is acting in contrary ways to nature – yet lives on!

Nature demands from human life to distribute its harvest equally among them. Yet the fear of previous experience of starvation, forbids letting go of material gains. Nature also commands not to make interest on unearned money. Yet the Wall street and stock markets of the world are hell-bent on playing hard rock music on the sweat and blood labour of zillions. Nature puts a ban on imposing your beliefs on others. *(La iqra fidth deen, 2:57)* Yet the institution of priestcraft forces others to worship their stinking gods. Or they throw you out of their community; show you the red-card dogma of which they provide no evidence whatsoever. Nature wants human life to live peacefully. Yet, distrust and doubt makes us go to war, again and again. Nature is silent in horror after observing *icy deceptions* in human relationships. This silence in nature, perhaps, is a humble request to human life to stay within truthful confines. Yet, man's limited knowledge projects a distorted view of life and leads astray. The list goes on and on and on, as time flies by. All representatives in the United Nations Organization are lost in the facades and lies, which obstruct justice. Yet we cling on to each other, in the hope, one day somewhere in the distant future, we will be able to stand united – in action as well as in our beliefs. Call me a lunatic or abnormal, if that pleases you gentlemen. Do not, in the name of anything you love or admire, obstruct the path leading towards peace. Or the reclining sofa-bed intellectual deceive you. One single wrong custom, approved by any culture, for centuries raises hell worse than the atrocities of a despot.

It appears for now, us human species are an uninvited guest on this burnt out star. Nature never has and never will change her process of transformation. We need more knowledge to decipher its character that should aid us in co-operating with nature. We must make our beliefs more adaptable, in the passage nature ordains. For that we are asked. Think! We have no other home to go, except this planet called "Earth." In order to make sense of this life, we must accommodate each other in a more cozy and comfortable manner. Mr. J.

Chaudhary in the February 2006 periodical of Tolu-e-Islam has directed the attention of readers towards an extremely vital issue. If overlooked, it can magnify and possibly end in disastrous repercussions. The issue of *Hajis* stampede in Mecca, Saudia Arabia, during the annual *Haj* rituals. Since 1980, on every occasion Muslims, who are weak and aged, are being killed ruthlessly by other Muslims performing Haj, who crush them under their feet. All this is happening in the house of Allah, in the name of Islam. Torture of animals is condemned all over the world. Disrespect of other human beings, is also looked down upon and offensive. Not only disregard but to brutally tread and kill other human lives who believe in the same peaceful Islam, is sheer barbaric attitude. It is a conspiracy to transform Mecca into a holy jungle. Allah never has or ever will come down from His supernatural throne – His angels are working for Him. Given these circumstances, only and only the Saudia Arabian government can change this horrifying situation.

If it had been white man's problem (I'm not into the racist games gentlemen) as Mr. J. Chaudhary states, in my view his government machinery would have restricted the number of Hajis coming to Mecca for pilgrimage and put a quota on them by now. Taking again into consideration the number of Hajis who can comfortably perform Haj rituals. The second important factor, on this issue they would consider, is the age of Muslims, coming in for Haj purposes. The older generations have less time to live compared with younger ones. Their faith is more established, obviously, because they have experienced more distractions in life. Hence the older Muslims must have been given foremost priority. The handicapped would have been provided with electronic wheel chairs, for all shapes and sizes of Muslims. They would have built chair lifts for those who intend to go up the holy mountain. The younger generation as I said has, on the average more lifetimes at their disposal. The white man would have allowed only "Umras" for them. Hypothetically speaking, he would have put a minimum age limit block for Haj pilgrims. Let us say 40 years. By the way, Islamic history tells us, that was Messenger's age when the first revelation came and made him aware of the Creator of this universe.

Let us suppose Saudia Arabia can easily support in Mecca 30,000 Hajis each year. Needless to say, their interior ministry representatives would be in knowledge of the exact figures, as to how many Hajis can perform the rituals without causing stampede. Now this hypothetical figure of 30,000 would have been divided among all nations having Muslim population. Dividing the number of incoming Muslims' quota among all nations, again would depend on the statistical figures of Muslims in those nations who are between the ages of 40 and 80 years. They would even have inquired, nobody enters Mecca for Haj on borrowed funds or someone else's expense. People performing Haj for the second time would be considered last on the priority list. The white man would have done what he has done with the Vatican city in Rome; in that jurisdiction I have been told, you have nothing to do with Italian government. He would have made Mecca completely exclusive, in the same manner, with no interference of

Arab government. He would have let the devil play his games outside of Ka'aba. The cover of Ka'aba, for reasons unknown to me, is black – the white man, probably, wants nothing to do with it.

Man as mentioned before, is demonstrating and proving in deed, everything contrary to the mainstream of natural events. Islam is a natural system – only for honest peace lovers. To convince all Muslims that "Haj" originally was meant as a peaceful annual meeting, in God's house to solve the problems of all Muslims' countries and humankind at large. For that we need centuries to cross. Muslims have a long journey ahead to eliminate the acid that prevails and is making Haj more and more meaningless with each passing year. Muslims go for Haj to seek an answer to their problems of life, and return home in their coffins. Gentle heart, who would call that a peaceful Islam?

I pray for all Muslims and so-called Muslims God speed, in searching for a practical answer to this wreckless killing in Allah's house. I pray from the depths of my tormented heart.

The pioneers, in their times were respected as Muslims;
You've divorced Quran, hence now are mocked as Muslims. -Iqbal

==========